تحقیق نامہ

تحقیقی مجلّہ　　جنوری تا جون ۲۰۱۷ء　　شمارہ: ۲۰

سرپرست

پروفیسر ڈاکٹر حسن امیر شاہ (ستارۂ امتیاز)

وائس چانسلر جی سی یونیورسٹی، لاہور

مُدیر

پروفیسر ڈاکٹر محمد ہارون قادر

صدرِ شعبۂ اُردو/ پنجابی جی سی یونیورسٹی، لاہور

نائب مُدیر

ڈاکٹر سفیر حیدر

اسسٹنٹ پروفیسر، شعبۂ اُردو، جی سی یونیورسٹی، لاہور

Estd. 1864

شعبۂ اُردو

جی سی یونیورسٹی، لاہور

ISSN 1997-7611

مقالہ نگاروں کے لیے چند ہدایات

مجلّہ ''تحقیق نامہ'' میں اشاعت کی غرض سے تحقیقی مضامین ارسال کرنے والے محققین سے درخواست ہے کہ وہ درج ذیل امور کو مدِّنظر رکھیں:

, تحقیقی مقالہ جات میں تمام حواشی اور حوالہ جات/کتابیات شکاگو مینوئل کے مطابق درج کیے جائیں۔

- اگر نثری اقتباس تین سطور یا اس سے زائد ہو تو اسے الگ سے پیرا گراف کی صورت میں لکھا جائے گا، اقتباس کو ہر صورت میں متن سے الگ نظر آنا چاہیے۔ اقتباس واوین میں درج ہوگا۔ اقتباس کے آخر میں حوالہ نمبر لکھا جائے گا۔ اگر اقتباس تین سطور سے کم ہو تو اس صورت میں اقتباس واوین میں لایا جائے گا اور اس کے اختتام میں حوالہ نمبر لکھا جائے گا۔ اشعار کو ان کی صنف سے وابستہ ہیئت ہی میں لکھا جائے گا۔ اشعار کا متن واوین کے بغیر مقالے میں شامل ہوگا۔ اختلافِ متن، صحتِ املا، توضیحی نوٹ اور اس نوعیّت کے معاملات حواشی میں اُٹھائے جائیں گے۔ اس مقصد کے حصول کے لیے اقتباس میں نمبر یا کوئی علامت دی جاسکتی ہے۔

. پہلی بار حوالہ مکمل تفصیل کے ساتھ درج کیا جائے گا۔

/ دوسری بار حوالہ درج کرنے کی صورت میں حوالہ مختصر لکھا جائے گا۔ دوسری بار حوالہ لکھتے ہوئے صرف مصنّف کا نام، کتاب یا رسالے کا نام اور صفحہ نمبر درج ہوگا۔ اوپر نیچے ایک ہی حوالہ درج کرنے کی صورت میں دوسری مرتبہ فقط ''ایضاً'' لکھا جائے گا۔ اگر صفحہ نمبر مختلف ہو تو اس کا اندراج کیا جائے گا۔

☆☆☆

ترتیب

پیش لفظ	مُدیر	۵
ہندوستانی مسلمانوں کے محسن اعظم سرسید احمد خان	ڈاکٹر سعادت سعید	۷
علامہ اقبال، ہائیڈل برگ اور 'ایک شام'	ڈاکٹر خالد محمود سنجرانی	۱۵
لاہور میں نوآبادیاتی عہد میں مذہبی و مناظراتی اُردو نثر	ڈاکٹر نسیمہ رحمٰن	۳۳
اُردو صحافت (۱۸۵۷ء کے تناظر میں)	ڈاکٹر صائمہ ارم	۴۶
میراجی اور ذخیرۂ نقوش	ڈاکٹر محمد سعید	۵۱
الاتقان کا منہج و اسلوب	ڈاکٹر محمد فاروق حیدر	۶۳
پنجابی زبان کی ایک نامکمل اور نایاب تفسیر (''تفسیر محمد امینؒ'' از محمد عمر اتالیہ)	ڈاکٹر محمود الحسن بزمی	۷۵
اُردو میں سلینگ بنانے کے اسباب اور طریقے	لیلیٰ عبدی خجستہ	۸۷
جہاد کا حقیقی مفہوم افکار اقبال کے تناظر میں	ڈاکٹر محمد سرفراز خالد	۱۰۱
مجلسِ ترقی ادب لاہور کی شعری تدوینی روایت	ڈاکٹر عظمت رباب	۱۱۱
''ضحاک ماردوش'' شاہنامۂ فردوسی کی ایک اساطیری داستان کا تجزیاتی مطالعہ	ڈاکٹر محمد اقبال ثاقب	۱۱۹
علامہ محمد اقبال اور رتن سنگھ زخمی کی منقبت حضرت علیؑ کا تجزیاتی و تقابلی مطالعہ	ڈاکٹر بابر نسیم آسی	۱۳۵
شمس الرحمٰن فاروقی بحیثیت نقاد	ڈاکٹر شائستہ حمید خان	۱۴۳
مرثیہ: انیس و دبیر کے بعد	ڈاکٹر سیّدہ مصباح رضوی	۱۴۹
نظریہ، جغرافیہ اور پاکستانی ثقافت	ڈاکٹر محمد نعیم	۱۵۵
جان گل کرسٹ اور مولوی عبدالحق کے ہاں قواعدی مماثلتیں	ڈاکٹر ساجد جاوید	۱۶۴
اُردو کا پہلا افسانہ: تحقیقی و تجزیاتی مطالعہ	ڈاکٹر شاہد نواز	۱۷۲
اُطاقِ اقبال کا تعین	ڈاکٹر الماس خانم	۱۸۰
ترقی پسند معترضینِ غزل ــــ اور کلاسیکی غزل	ڈاکٹر فرزانہ ریاض	۱۹۱
کشمیر کا علاقائی و لسانی جائزہ	ڈاکٹر اصغر اقبال	۱۹۹
''ابن صفی مشن اور ادبی کارنامہ''..... تنقیدی جائزہ	ڈاکٹر فیض رسول انصاری	۲۰۳
سرسید، شبلی، شرر اور ابوالکلام آزاد کی فکری مماثلتیں	ڈاکٹر محمد امین خاور	۲۱۰
کشمیری زبان پر اُردو کے اثرات	ڈاکٹر سید علی رضا	۲۱۹

پاکستانی تہذیب کے مباحث	ڈاکٹر صفدر نعیم	۲۲۴
ٹی وی مزاحیہ اُردو پروگرام ''حسبِ حال'' کا جائزہ	ثنا ہارون	۲۳۰
کمال احمد رضوی کا منفرد کھیل ''شیشیوں کا مسیحا''	ڈاکٹر محمد نوید	۲۳۹
قدرت اللہ شہاب بہ حیثیت افسانہ نگار	مہتاب کرن	۲۴۶
تحریک خلافت مولانا ظفر علی خاں کی شاعری کے آئینے میں	مظہر اقبال	۲۵۲
سمیع آہوجا کے افسانوں میں تکنیک اور کرافٹ کا جائزہ	جمشید علی	۲۵۹
''حاصل گھاٹ'' کے تارکین وطن	عزیزہ سعید	۲۶۴
نجیب محفوظ کی تخلیقی حسیّت	ڈاکٹر سفیر حیدر	۲۷۱
فرہنگِ مصطلحاتِ میرزا قتیل	پروفیسر ڈاکٹر محمد اقبال شاہد/نسیم الرحمان	۲۷۷
غالب کی فارسی نعتیہ شاعری	ڈاکٹر غلام اکبر/محمد سرور	۲۸۷
''یہ جہاد'': روشن خیالی، مزاحمت اور مابعد جدید فکشن کی مثال	ڈاکٹر قاضی عابد/ ڈاکٹر روبینہ رفیق	۲۹۳
اقبال کا تصورِ کائنات	ڈاکٹر محمد ارشد اویسی/ صائمہ بی بی	۳۰۰
حافظ شیرازی کی غزلیات میں علم الاخلاق کا تحقیقی جائزہ	ڈاکٹر محمد اقبال ثاقب/ ڈاکٹر اقصیٰ ساجد	۳۰۶
''ہیر'' وارث شاہ: انسائیکلوپیڈیا آف پنجاب	ڈاکٹر محمود الحسن بزمی/ واصف لطیف	۳۱۶
''حسن کی صورتحال'' خالی.....جگہیں.....پُر.....کرو'' تجزیاتی مطالعہ	ڈاکٹر نسیمہ رحمٰن/ خدیجہ شاہد	۳۲۸
میراجی کی ایک گم شدہ بیاض کی دریافت	ڈاکٹر محمد سعید/ ڈاکٹر سیّدہ مصباح رضوی	۳۳۵
ایڈورڈ سعید اور ''شرق شناسی''	ڈاکٹر ثوبیہ طاہر/ ڈاکٹر الماس خانم	۳۴۵
ڈاکٹر پیر محمد حسن کی ترجمہ نگاری کا تحقیقی مطالعہ تصوف کی مآخذ کتب کی روشنی میں	ڈاکٹر امتیاز احمد/ سید عدنان عالم زیدی	۳۵۸
اُردو اطلاعیات کے شعبے میں اداروں کا کردار	پروفیسر ڈاکٹر سلمان علی/ وہاب اعجاز	۳۶۷
خواجہ مسعود بکؒ بے باک صوفی شاعر	ڈاکٹر بابر نسیم آسی/ ڈاکٹر فرزانہ ریاض	۳۷۳
نزار قبانی کی رومانوی نظمیں	ڈاکٹر سفیر حیدر/ پروفیسر ڈاکٹر محمد ہارون قادر	۳۸۰
انڈیکس	مُدیر	۳۹۰

☆☆☆

پیش لفظ

''تحقیق نامہ'' باقاعدگی سے اہلِ علم وادب کی تحقیقی ریاضت کو منصۂ شہود پر لا رہا ہے۔ زیرِ نظر شمارہ بھی ہمہ جہت علمی اور ادبی جہات پر مباحث کو اپنے دامن میں سمیٹے ہوئے حاضر ہے۔ علومِ اسلامیہ کے ماہرین کی علمی جستجو کا ثمر بھی پیشِ خدمت ہے اور فارسی کے محققین کے تقابلی مطالعات اور فارسی شناسی کے مختلف گوشوں پر بھرپور مقالے بھی شامل ہیں۔ اُردو ادب پر قلم فرسائی کرنے والوں کے ذاتی ذوق وشوق کے تنوع نے بھی اس شمارے کو کثیر الجہت اصنافِ سخن کی نئی تفہیم اور تعبیر سے آراستہ کیا ہے۔ اُردو ادب کی ہر صنفِ سخن وقت کے ساتھ ساتھ الگ شعبۂ ادب کی حیثیت اختیار کر چکی ہے۔ ناول کے فن، تصوّرات اور رجحانات پر بھی مقالے وصول ہوئے اور افسانے کے موضوع، اسلوب اور ہیئت کے مباحث پر بھی تحریریں شامل ہیں۔ مرثیہ شناسی، نظم فکری اور فنی مطالعات، غزل کے نظری مباحث کے ساتھ ساتھ شمارہ ہذا میں ادب کی نظریہ ساز شخصیات کی علمی اور معاشرتی خدمات اور لسّانی تقابلی مطالعات بھی صاحبانِ فکر ونظر کی توجہ کے مستحق ٹھہریں گے۔ اس فکری اور تحقیقی تنوع کے باوجود تشنگی کا احساس بھی موجود رہتا ہے کہ ایک ہی شمارے میں علم وادب کی ساری شاخوں کا احاطہ کہاں ممکن ہے۔ نارسائی کے اس احساس کے ساتھ ظفر اقبال کے اس شعر کو وکیل کرتے ہوئے تحقیق نامہ شمارہ نمبر ۲۰ پیشِ خدمت ہے:

؎ میں نے کب دعویٰ کیا تھا سر بسر باقی ہوں میں
پیشِ خدمت ہوں تمہارے جس قدر باقی ہوں میں

ایک انفرادی تذکرہ بھی واجب ہے کہ جب شعبۂ اُردو کا تعارف نامہ شائع ہو تو ڈاکٹر ثاقب نفیس کا تعارف شامل نہیں ہو سکا۔ ڈاکٹر صاحب نے اپنی خدمات کا آغاز فیصل آباد سے کیا اور پچیس سال (۲۰۱۲ء۔ ۱۹۸۷ء) گورنمنٹ کالج لاہور سے وابستہ رہے اس دوران ایم۔فل ڈاکٹر سیّد معین الرحمٰن اور پی ایچ۔ڈی ڈاکٹر سہیل احمد خاں کی رہنمائی میں مکمل کی اور کنٹرولر امتحانات شعبۂ اُردو، انچارج کوئز سوسائٹی، معاون مجلس اقبال اور تدریسی حوالے سے انٹرمیڈیٹ تا پی ایچ۔ڈی اپنی خدمت سرانجام دیں۔

اس شمارے کے تکمیلی دورانیے میں اُردو ادب کی معروف ہستی بانو قدسیہ کی اس عالمِ فانی سے دار بقا کو رُخصت ادب کے داستان سرائے کو اُداس اور ویران کر گئی۔ یہ ادبی دُنیا کے ساتھ ساتھ جی سی سے وابستہ گھرانے کا نقصان اور بھی زیادہ ہے۔ ان للہ وانا الیہ راجعون۔

آخر میں ان تمام احباب کا شکریہ واجب ہے جو اپنی تحقیقی ریاضتوں کے ثمر ''تحقیق نامہ'' کے لیے ارسال کرتے ہیں اور ''تحقیق نامہ'' کی باقاعدہ اشاعت اور وقعت انہی کے مرہونِ منت ہے۔

نائب مُدیر
ڈاکٹر سفیر حیدر
اسسٹنٹ پروفیسر شعبۂ اُردو
گورنمنٹ کالج یونیورسٹی، لاہور
safeer.worldliterature@gmail.com
Mobile #: 0321-4872185

مُدیر
پروفیسر ڈاکٹر محمد ہارون قادر
صدرِ شعبۂ اُردو، پنجابی
گورنمنٹ کالج یونیورسٹی، لاہور
dr.haroonqadir@gmail.com
Mobile #: 0333-4252407, 0303-3330345
Office #: 99213339

☆☆☆

ہندوستانی مسلمانوں کے محسن اعظم سرسید احمد خان

ڈاکٹر سعادت سعید، وزیٹنگ پروفیسر شعبۂ اُردو، جی سی یونیورسٹی، لاہور

Abstract

Sir Sayed Ahmad Khan was a great leader for south Asian Muslim Nation. He fully guided them after the horrible end of their glorious past in India. He analyzed the causes of their defeat thoroughly and gave them a new vision for their survival in the future. He suggested to the Muslims of India that they should learn English language and through it new scientific knowledge which could take them to the path of modern enlightenment in this article his rational approach, is discussed.

ایک اجنبی ثقافت کے ہاتھوں مفتوحہ عوام کی ثقافتوں کی بربادی کا غم ہو، جنگ آزادی کی نذر ہونے والی بے گناہ آبادیوں کا دکھ ہو، محفلوں کے لٹنے کا نوحہ ہو، غم رزق ہو یا غم عزت یہ سب کچھ ایک حساس انسان کی طرح سر سید احمد خان کے ضمیر کا کانٹا بنا۔ انہوں نے اپنے دور کے ہندوستان میں بسنے والی اپنی قوم کو انفعالیت، بے عملی، یاسیت، کسمپرسی، بے بسی کی دلدلوں سے باہر نکالنے کے لیے باقاعدہ منصوبہ بندی کی۔ ان کے سامنے سب سے پہلا کام یہ تھا کہ وہ اپنی قوم کی ازسرنو شیرازہ بندی اور یک جہتی کے لیے کوشاں ہوں۔ انگریزی اقتدار کی وجہ سے وہ جس سیاسی بحران کا شکار تھی اسے اس سے باہر لا کر نئے سیاق وسباق میں سیاسی آزادی کی تحصیل کے امکانات کی جانب عملی طور پر پیش قدمی کی دعوت دی جائے۔

سرسید احمد خان کو احساس تھا کہ سیاسی طور پر آزاد ہونے کے لیے فی الفور کوئی منصوبہ کارآمد ثابت نہیں ہوگا۔ ہندوستان پر مسلمانوں کی طویل مقامی حکومت کے خاتمے کی وجہ سے ان کی زندگیوں میں جس نوع کا خلا پیدا ہوا تھا اور مستقبل میں ان کی ثقافت پر اس کے جو اثرات مرتب ہونے والے تھے سرسید احمد خان نے ان کے بارے میں غور وخوض کیا اور اپنے آپ کو اس بات پر آمادہ کیا کہ انہوں نے اس غیر متوقع آفت سے اپنے بھائی بندوں کو نجات دلانے کے لیے کچھ نہ کچھ تو کرنا ہے۔ چنانچہ ان کی ضمیری نفسیات نے انہیں اپنی قوم کو اپنے پاؤں پر کھڑا کرنے کی جو ترغیب دی اس سلسلے میں اٹھائے جانے والے اقدام کی بدولت انہیں مثبت کامیابیاں ملنے کی توقع تھی۔

ماضی میں ہندوستان ایک کثیر القومی ملک تھا، حال میں بھی اس کی یہی حالت ہے اور مستقبل میں بھی اس صورتِ حال کے تبدیل ہونے کا کوئی امکان نہیں۔ سرسید احمد خان کو جہاں انگریزی غاصبانہ اقتدار کی نزاکتوں کو سمجھ کر میدان عمل میں اترنا تھا وہاں انہیں اس امر کا احساس بھی تھا کہ ماضی میں مسلمان فاتحین نے ہندوستان پر جو اقتدار قائم

کیا تھا اس کے خلاف مقامی قومیتوں کا شدید ردعمل سامنے آ سکتا ہے اور وہ قومیتیں مسلمانوں کو نقصان پہنچا سکتی ہیں۔ ایسے میں ان کے سامنے داخلی طاقتوں کی دست برد سے مسلمانوں کو محفوظ رکھنے کا خطرناک معاملہ بھی تھا۔ چنانچہ انہوں نے اپنی سیاسی بصیرت کو کام میں لا کر مسلمانوں کو از سر نو اقتدار کی مین سٹریم میں لانے کے لیے عملی اقدامات کرنے کی ضرورت کو محسوس کیا۔ اس احساس کی بدولت وہ مستقبل میں قومی حفاظت کے لیے سرگرم عمل بھی رہے۔

سرسید احمد خان جانتے تھے کہ نئے نافذ شدہ انگریزی سیاسی، انتظامی اور ثقافتی نظام میں اگر مسلمانوں کو معاشی ترقی کی منزلوں کی جانب سفر کرنا ہے تو انہیں اپنی ان تمام قدیم پیشوں کو ترک کر کے کہ جو مسلم شاہی اقتدار کو سنبھالا دیئے ہوئے تھے، نئی طرز کے پیشوں کو اپنانا ہے تا کہ نئے زمانی تقاضوں کو پورا کیا جا سکے۔ اس سیاق وسباق میں انہوں نے مسلمانوں کے لیے ہندوستان میں رائج ہونے والے نئے پیشوں سے وابستگی کو از بس ضروری قرار دیا اور ان سے مطالبہ کیا کہ وہ انگریزوں کے قائم کردہ نئی طرز کے مدرسوں سے جوق در جوق نئے نصابوں کے تحت تعلیم حاصل کر کے انگریزی اقتدار میں اپنے لیے مناسب جگہیں بنائیں۔

مرزا غالب نے یہ شعر جس بھی پس منظر میں لکھا ہو کہ:

نے گلِ نغمہ ہوں نہ پردۂ ساز میں ہوں اپنی شکست کی آواز

اسے قومی شکست کے حوالے سے دیکھنے میں کوئی ہرج نہیں ہے۔ سرسید کو احساس تھا کہ مسلمان اب نہ تو اقتدار میں رہے ہیں اور نہ ہی ان کی ہندوستان کے نئے سیٹ اپ میں کوئی زیادہ اہمیت ہے۔ ان کی طاقت کا شیرازہ بری طرح بکھر چکا ہے۔ ان کی شان وشوکت ملیا میٹ ہو چکی ہے۔ دشمنوں نے انہیں گھیر رکھا ہے۔ وہ اس وقت تک اس صورت حال کے قیدی رہیں گے جب تک وہ اپنی قومی طاقت کی بازیافت نہیں کر لیتے۔ کسی قوم کو اپنے پاؤں پر کھڑا ہونے کے لیے جس نوع کی صنعتی ترقی، سائنس اور ٹیکنالوجی کی تحصیل کی ضرورت ہوتی ہے سرسید احمد خان اس امر سے پورے طور پر واقف تھے چنانچہ وہ چاہتے تھے کہ مسلمان نئے تعلیمی تقاضوں کی روشنی میں نئے سرے سے نئی طرز کی خواندگی کی جانب آئیں گے تو ان میں سائنسی تحقیق کا مادہ پیدا ہوگا جو آئندہ چل کر انہیں ہر نوع کے جدید پیداواری نظام کے تقاضوں کے مطابق عمل پیرا کر سکے گا۔ نئے انگریزی نظام میں مسلمانوں کو سب کچھ صفر سے شروع کر کے خود کفالت کی منزلوں تک رسائی کے مرحلے درپیش تھے۔ سرسید احمد خان نے مسلمانوں سے توقع باندھی کہ وہ ان مرحلوں سے آشنا ہو کر قومیتی مقابلے کی دوڑ میں سبقت لینے کے اہل ثابت ہوں گے۔

سرسید احمد خان نے مسلمانوں کو جس ڈگر پر ڈالا اس پر مشرقی ذہنیت رکھنے والے جتنے بھی چیں بہ جبیں کیوں نہ ہوئے ہوں اور کٹھ ملائیت کے مرض میں مبتلا لوگوں نے ان کی جتنی بھی مخالفت کی ہو سرسید احمد خان کی دانست میں قومی وقار اور ملی نظریات کی حفاظت کے لیے مسلمانوں کو تعلیم کے میدان میں استقلال کے ساتھ آگے بڑھنا ہی ہوگا۔ ان کے لائحہ عمل میں اس وقار اور نظری تحفظ کے معاملے برسر فہرست موجود تھے۔ اس فہرست کے دیگر مندرجات میں قومی انفرادیت، حق خود ارادیت، عظمت وشوکت کی بازیافت، آزادی کا احساس، اپنی زمین سے

محبت، قومی خودی کی بحالی وغیرہ شامل تھے۔ علاوہ ازیں انہیں یہ سب کچھ انگریزی استعمار اور اس کی عملی حکمتوں کے عین درمیان میں رہ کر کرنا تھا۔ ان حکمتوں میں سے ایک حکمت ''تقسیم کرو اور حکومت کرو'' بھی تھی۔ اس حکمت عملی کے تحت مسلمانوں اور ہندوؤں، سکھوں اور مسلمانوں کے مابین یہ یہ تفرقے پیدا کئے گئے اور ان کے درمیان باہمی مناقشات اور نزاعات کے غیر مختتم سلسلے شروع کروا دیئے گئے۔ یعنی پاکستان کا قیام انگریزوں کی اسی ''بٹوارانہ حکمت عملی'' کا منطقی نتیجہ ثابت ہوا۔ آلڈس ہکسلے کا کہنا ہے:

> ''الفاظ وہ رابطہ ہیں جن کے ذریعے ہم اپنے تجربات کو مربوط رکھتے ہیں۔ ان کے بغیر ہم اپنے آپ تک محدود ہو جاتے ہیں۔ ''نفرت'' از خود اتنا مضبوط جذبہ نہیں ہے کہ اس کو حیوان بھلا نہ سکیں۔ حتی کہ دشمن کی موجودگی میں بھی بھلایا جا سکتا ہے۔ آپ کبھی بلیوں کے جوڑے کو جب وہ لڑنے کے قریب ہو، غور سے دیکھیں۔ ان کی آنکھیں خوفناک انداز میں چمکتی ہیں اور کے گلے سے خرخراہٹ کی عجیب سی آواز اٹھتی ہے اور عجیب سا شور، جب کہ ان کی دم پیچ و تاب کھاتی ہے اور غصے سے کانپتی ہے۔ اس دشمنی کی شدت کا کیا مقصد ہے۔ قریب ہے کہ وہ پھٹ پڑے کہ اچانک دونوں بلیاں مڑ جاتی ہیں اور ایک دوسرے کو سلام کرتی ہیں۔ اور وہی غصہ اور شدید نفرت اچانک ایک صلح بھری آواز میں بدل جاتی ہے۔ جانوروں کی محبت ان کی نفرت کی طرح مایوسی کے رحم و کرم پر ہوتی ہے۔ گونگی، بہری مخلوق کی زندگی ان کے آپس میں رضامندی کے بے جوڑ سے واقعات پر مشتمل ہوتی ہے۔ اسی طریقے سے انسانی کردار میں تبدیلی اور جامعیت کا انحصار ان الفاظ پر ہوتا ہے جن کے ساتھ تمام انسانی تجربے کو مربوط کیا جاتا ہے۔ ہماری بات با مقصد ہے اور اس لئے با مقصد ہے کہ ہم اپنے جذبات کا اظہار ان الفاظ میں کریں جو ہماری خواہشات کو منطقی طور پر عقل اور جواز دے سکیں۔ جب ہم کسی دشمن کے سامنے ہوتے ہیں تو ہم اجازت نہیں دیتے کہ ہمارے جذبات ایک سر کھجانے کی حد تک بھی اپنے اصل سے ہٹ جائیں۔ کیونکہ لفظ ''دشمن'' ہی اس بات کے لیے کافی ہے کہ ہم اس سے نفرت کرتے ہیں اور وہ ہمیں اس سے ناراض ہونے پر قائل کرتا ہے۔ اسی طریقے سے لفظ ''محبت'' بہت سی بے پرواہیوں اور اکتاہٹوں کے ان شگافوں کو پر کرنے کا نام ہے جو وقتاً فوقتاً بہت ہی قریبی پیار کرنے والوں کے درمیان ہوتا ہے۔ احساس اور خواہش دونوں ہم میں قوت محرکہ پیدا کرتے ہیں۔ الفاظ ہمارے کام میں تسلسل اور سمت متعین کرنے کا باعث ہوتے ہیں۔ غیر مناسب اور الفاظ کا برا انتخاب ہمارے خیالات کو پست کرتا ہے اور ہم سے غلطیاں اور حماقتوں کا باعث بنتا ہے اور بہت سی لاعلمیوں پر قابو پایا جا سکتا ہے۔ بہت سی حماقتوں کو جن کو گوتم بدھ گناہ قرار دیتے ہیں وقت سے پہلے روکا جا سکتا ہے۔ کیونکہ شعوری طور پر اور غیر شعوری طور پر ہم کبھی بھی سمجھنے میں ناکام نہیں رہتے اور بعض اوقات ناسمجھی

ہمیں بہت سی ناخوشگوار ذمہ داریوں سے بچا دیتی ہے۔ کیونکہ لاعلمی ایک بہترین بہانہ ہے کہ انسان پسند کے کام کرے اور ناپسند کاموں سے انکار کر دے۔ ہماری خود پرستی ہمیں نہ صرف ہمارے خارجی دشمنوں سے محفوظ رکھتی ہے بلکہ ان تمام ذاتی حملوں سے بھی جن سے وہ نہ چاہتے ہوئے بھی منسوب ہوتی ہے۔ جہالت خود پرستی کا ایک بہت ہی موثر دفاعی نظام ہے جو ہمیں حماقتوں سے بچاتا ہے۔ اگر ایسا ہو جائے تو ہم اپنے تجربات کو تسلسل دینے کے لئے ان الفاظ کا سہارا لیتے ہیں جو حقائق کو غلط ثابت کرتے ہیں اور حقائق کا غلط ثابت کرنا ہی ہماری خود پرستی کے لئے مفید ثابت ہوتا ہے۔'' [۱]

انگریزوں نے ہندوستانیوں کے مقابلے میں انتہائی قلیل تعداد میں ہوتے ہوئے بھی جس دھڑلے سے حکومت کی اور اپنے اقتدار کو مستحکم کیا اس کے پیچھے باہمی محبتوں اور نفرتوں کے کئی سلاسل کو ابھار کر ہندوستانی عوام کو دست و گریبان کر دیا اور اس کے نتیجے میں خود چین سے حکومت کی۔ انگریزی اقتدار کے ابتدائی دور سے لے کر سن سینتالیس تک ہندوستانی عوام باہمی دشمنیوں اور نفرتوں کے چکروں میں گرداں رہے اور انگریزی پرنس حکومت کرتے رہے۔ میکاویلین پالیسیوں کے چراغ جلتے رہے اور مقامی باشندے نفرتوں اور دشمنیوں کی آگ میں جھلستے رہے۔ ہندوستان پر قبضہ کرنے کے لیے انگریزوں نے جس ''لیم ایکسکیوز'' کا سہارا لیا اور قابض ہونے کے بعد جس طرح مقامی باشندوں کو اجنبی ہونے پر مجبور کیا وہ ان کی میکاویلین حکمت عملی سے جنم لینے والی سازشوں اور ریشہ دوانیوں کا شاخسانہ ہے۔

اس پر علامہ اقبال نے کھل کر اس امر کا اظہار کیا ہے کہ ہندوستانی عوام افتراقات کا شکار ہیں انہیں مجتمع ہو کر انگریز سامراج کا مقابلہ کرنا ہے۔ لیکن افسوس کہ میکاویلین حکمتوں کے نتیجے میں مقامی ہندوستانی باشندے انگریزوں کے ہاتھوں کٹھ پتلی بن کر ایک دوسرے کے خون کے پیاسے ہو گئے، یہاں تک کہ وہ یہ بات یاد کرنے کو بھی تیار نہیں ہیں کہ ہندوستان سے انگریزوں کو نکالنے کے لیے ہندوؤں اور مسلمانوں نے بہادر شاہ ظفر اور رانی جھانسی کی قیادت میں متحدہ لڑائی لڑی تھی۔ اس لڑائی کو سکھوں نے انگریزوں کے ساتھ مل کر ناکام کیا اور یوں ہندوستان میں تینوں بڑے سٹیک ہولڈرز باہمی نفرتوں اور دشمنیوں کے ایسے سلاسل کے اسیر ہو گئے کہ انہیں ایک دوسرے کو اپنی اپنی مذہبی اور سیاسی منطق کے تحت قتل کرنا مقدس لگنے لگا۔ اب ہم دیکھتے ہیں کہ یہ تینوں قومیں اپنے اپنے شہیدوں کے دن مناتے ہوئے ایک دوسرے کے خلاف اپنی نفرتوں اور دشمنیوں کے بھانبڑ جلاتی رہتی ہیں۔ یعنی ایک دھرتی کے باشندے مذہبی اور سیاسی نفرتوں کے اسیر ہو کر ایک دوسرے کے خون کے پیاسے ہیں اور دشمن سات سمندر پار بیٹھا ان کو متواتر اپنی صنعتوں کا مال اور اپنے اسلحے فروخت کر رہا ہے۔ اس صورت حال کو ان کی نئی یا پرانی لسانی نریشنیں تقویت دے رہی ہیں۔ اور یوں جس نوع کی نفرتوں اور دشمنیوں کو مرکز خطابت بنایا جاتا ہے اس کے نتیجے میں مقامی مناقشات میں روز بروز افزونی آتی چلی جاتی ہے اور انسانی اخلاقیات فراموشی کے گڑھوں میں گرتی چلی جا رہی

ہے۔ بقول آلڈ ہکسلے :

''ہمارے احمق لوگ غلط زبان استعمال کر کے ایسا تجزیہ پیش کرتے ہیں جو کہ انتہائی عیاری پر مشتمل ہوتا ہے۔ جنگ کے متعلق سب سے بڑے صدمے والی چیز یہ ہوتی ہے کہ اس کا شکار ہونے والے یا آلہ کار انسان ہوتے ہیں۔ اور یہ انسان سیاست کی مکروہ روایات کی خاطر قتل ہوتے ہیں یا معصوم لوگوں کو قتل کر دیتے ہیں۔ اور یہ ہر قسم کے ظلم کی انتہا ہے۔ اب سیاست کو بیان کرنے کے لئے زبان کی حکمت عملی اختیار کی جاتی ہے۔ اور سچ کو اس طرح چھپایا جاتا ہے کہ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ جنگ درحقیقت بغیر قصور کے غیر اخلاقی سفاکانہ قتل کا نام نہیں بلکہ مدمقابل کو ایک ایسی قوت کے طور پر پیش کیا جاتا ہے کہ جس کو ختم کرنا اخلاقی ذمہ داری بن جاتی ہے۔''[۲]

اس پس منظر میں علامہ اقبال کی مثنوی ''پس چہ باید کرد اے اقوام شرق'' کا یہ اقتباس کہانی کے مذکورہ رخ سے پردہ اُٹھاتا ہے:

ہندوستانیوں کے نفاق پر چند آنسو
اے ہمالہ اے اٹک اے رود گنگا
یوں رنگ اور چمک کے بغیر کب تک زندگی بسر ہو؟
بوڑھے مرد فراست سے خالی ہیں اور نوجوان محبت سے عاری
مشرق اور مغرب تو آزاد ہیں ہم ہی غیروں کا شکار ہیں
ہماری اینٹ غیروں کی تعمیر کا سرمایہ ہے
دوسروں کے مقصد کے لئے جینا گہری نیند نہیں مرگ جاودانی ہے
یہ وہ موت نہیں کہ جو آسمان سے آتی ہے
اس کا بیج جان کی گہرائیوں سے سر اٹھاتا ہے
اس کے شکار کو نہ تو غسال چاہیے نہ ہی قبر
دور اور نزدیک سے دوستوں کا ہجوم بھی نہیں ہے
اس کے غم میں کسی کا لباس چاک نہیں ہے
اس کی دوزخ آسمان سے پرے نہیں ہے
اسے روز حشر کے ہجوم میں مت تلاش کر
اس کے آج ہی میں اس کا کل ہے
جس کسی نے یہاں بیج بویا یہیں کاٹا
اس بندے کو خدا کے سامنے لے جانا بے سود ہے

وہ قوم جس نے آرزو کا ڈنگ نہیں کھایا
فطرت نے اس کے نقش کو دنیا سے مٹا دیا
تخت و تاج کا اعتبار جادوگری سے ہے
یہ کانچ جادوگری سے پتھر کی مانند سخت ہے
اس روشن جادو کے حکم کو اختیار نہ کر
کافری کفر سے اور دین داری دین سے ہے
ہندوستانی ایک دوسرے سے برسرپیکار ہیں
انہوں نے پرانے فتنوں کو پھر سے جگا دیا ہے
یوں فرنگی مغربی زمین کے باشندے
کفر اور دین کے جھگڑے میں ثالث بن گئے
کوئی نہیں جانتا یہ چمک پانی کی نہیں سراب کی ہے
انقلاب، اے انقلاب اے انقلاب
اے کہ تجھے ہر پل آب و گل کی فکر ہے
خدا سے ایک زندہ دل طلب کر
اگرچہ اس کا آشیاں دنیا میں ہے
نو آسمان اس ایک دل کے سرگشتہ ہیں
ہرگز خیال نہ کر وہ مٹی سے ہے، آسمانوں کی بلندی سے ہے
اس کے لئے یہ جہاں اپنے دوست کی گلی کا حریم ہے
وہ لالے کی پوشاک سے اپنے محبوب کی خوشبو حاصل کرتا ہے
وہ ہر دم زمانے سے جنگ کر رہا ہے
اس کی ضرب سے راستے کا پتھر ریزہ ریزہ ہو جاتا ہے
وہ منبر اور دار سے واقف ہے
اس کی اپنی آگ اس کی محافظ ہے
وہ خود ایک ندی ہے لیکن اس کے اندر کئی سمندر موجود ہیں
اس کی موج طوفان کی خبر دیتی ہے
وہ تنور کی روٹی کے بغیر بھی زندہ اور پائندہ ہے
وہ اس گھڑی مرتا ہے کہ جب بے حضور ہو جاتا ہے

بدن کے شبستان میں چراغ کی مانند
اس سے خلوت اور انجمن دونوں روشن ہیں
ایسا خودنگر اور اللہ مست دل
کسی درویش کے بغیر دستیاب نہیں ہوتا
اے جوان اس کا دامن مضبوطی سے پکڑ
تو غلامی میں پیدا ہوا ہے آزاد انسانوں کی موت مر[۳]

کفر و دین کے یہ جھگڑے سرسید کے دور میں نمایاں ہو کر سامنے آئے۔ ہندو مسلمان سے نبرد آزما ہوا۔ ایک طرف سے مسلم تاریخ و ثقافت پر سکھ حملہ آور ہوئے اور دوسری طرف مسلمانوں نے دیو بندی اور بریلوی کے جھگڑے شروع کیے۔ اس سے مسلم قوم کی رہی سہی آبرو بھی جاتی رہی۔ سرسید احمد خان نے، اپنے تصورات کی روشنی میں، مسلم دنیا میں موجود علمی ذخائر کے ساتھ ساتھ نشاۃ الثانیہ کے بعد ابھرنے والے نئے علوم کو اہمیت دے کر مسلمانوں کو مستقبل میں سرخرو ہونے کے رستے پر گامزن کیا۔ ان کی تحریک روشن خیالی کی تحریک تھی۔

سرسید احمد خان کے علمی و ثقافتی کارناموں کی روشنی میں ہم کہہ سکتے ہیں کہ:

۱۔ سرسید نے جدید فکر و شعور کی مدد سے روشن خیالی کا عندیہ دیا۔
۲۔ وہ جدید علوم اور انگریزی زبان کے اکتساب کو امکانی ترقی کے لیے لازمی قرار دیتے تھے۔
۳۔ مذہبی روایت پرستی سے باہر نکل کر انہوں نے بعض مذہبی معاملات کی سائنسی اور عقلی توجیہات پیش کیں۔
۴۔ وہ مسلم ماضی کے ثقافتی اور تہذیبی اثاثوں کے قدر دان تھے
۵۔ روشن خیال تصورات کی تلاش میں وہ تاریخ کی جانب لوٹے اور انہوں نے اپنی نئی تعبیرات سے نئے سائنسی ذہن سے مکالمہ کیا۔
۶۔ سرسید احمد خان مذہبی اور روحانی زندگی کو مادی زندگی کی ترقیوں کی راہ میں حائل نہیں سمجھتے تھے
۷۔ ان کے خیال میں دانش اور عقل سے کام لینے میں انسانیت کی فلاح ہے۔
۸۔ وہ سائنس کے قانون علت و معلول کے تحت عقل و حواس کو بروئے کار لانے کی بات کرتے تھے۔ اس لیے انہوں نے کئی ایسی تعبیریں کیں جن سے مسلم ذہن نے اتفاق نہیں کیا۔
۸۔ مذہبی حوالوں سے عقل و دانش کا دفاع ان کی روحانی اور ماورائی اپروچ پر دال ہے۔
۹۔ سرسید احمد خان کی دور بین نظروں نے مستقبل کے بہت سے سیاسی و ثقافتی مناظر کو بھانپ لیا تھا۔ اس لیے انہوں نے ہندوستان کے مسلمانوں کے لیے ایک علحدہ مملکت یا ثقافتی جائے عمل کا تصور دیا تھا۔
۱۰۔ سرسید احمد خان نے ایک رہنما دانشور کی مانند عام انسانوں اور روایت پرست علما کے خیالات سے اختلاف کیا۔ یوں ہندوستان میں خیالات اور فکر کی نئی صورتوں نے سر ابھارا۔

۱۱۔ ان کی فکر نے مذہبی فکر میں انقلابی تبدیلیوں کے امکانات روشن کیے۔

۱۲۔ سائنٹفک سوسائٹی کے قیام کا مقصد واضح تھا کہ وہ چاہتے تھے کہ مسلمانوں کو سائنس کی برکات راس آئیں اور وہ بھی سائنسی میدانوں میں آگے بڑھ کر اپنا لوہا منوائیں۔

۱۳۔ سائنس کے ساتھ ساتھ روحانی معاملات پر ان کا یقین اس بات کی جانب اشارہ کناں ہے کہ انسان جب تک مادی کائنات کے ذرے ذرے کی تفہیم سے عہدہ برآ نہیں ہوتا اس کی روحانی اور مابعد الطبیعیاتی اپروچ موجود رہے گی۔

۱۴۔ ہر بڑا جینیئس انسانیت کی فلاح کے لیے اپنے فکر کے راہوار دوڑاتا رہتا ہے اور بالآخر اس نتیجے پر پہنچتا ہے کہ انسان کو آزادی، عزت نفس اور برابری کی اقدار کی ضرورت ہے۔ سرسید احمد خان نے اپنا یہ دانشورانہ منصب خوش اسلوبی سے پورا کیا ہے۔

حوالہ جات:

۱۔ آلڈس ہکسلے، الفاظ اور ہمارا رویہ، (ترجمہ) طاہرہ الطاف ملک، تخلیق مکرر، (لاہور: سوندھی ٹرانسلیشن سوسائٹی، جی سی)، شمارہ ۲

۲۔ ایضاً

۳۔ علامہ محمد اقبال، پس چہ باید کرد، اے اقوام شرق ، ترجمہ راقم الحروف، (لاہور: ادارہ ثقافت اسلامیہ، اشاعت دوم، ۲۰۱۵ء)، ص: ۳۹

مآخذ:

۱۔ آلڈس ہکسلے، الفاظ اور ہمارا رویہ، (ترجمہ) طاہرہ الطاف ملک، تخلیق مکرر، (لاہور: سوندھی ٹرانسلیشن سوسائٹی، جی سی)

۲۔ علامہ محمد اقبال، پس چہ باید کرد، اے اقوام شرق ، ترجمہ راقم الحروف، (لاہور: ادارہ ثقافت اسلامیہ، اشاعت دوم، ۲۰۱۵ء)، ص: ۳۹

☆☆☆